نجیبہ عارف*

تذکرۂ شعرائے لکھنؤ: ایک غیر مطبوعہ قلمی نسخے کی دریافت

Abstract:

Tazkira-i Shu'ra-i Lucknow: Discovery of a Rare Unpublished Manuscript

This article introduces a manuscript of the nineteenth century, hitherto unknown and unpublished, that lies in the Archives of the Bodleian Library, University of Oxford, UK. This manuscript is a collection of biographical notes in Urdu about the Urdu poets of Lucknow. Though the manuscript is not dated or named however the textual evidence shows that it was written by the renowned literary figure of Calcutta, Abdul Ghafur Nassakh, somewhere between 1872 and 1887. The manuscript consists of 12 chapters and each chapter gives the account of a Master poet and his notable pupils. It has been written on large sized, thin paper and consists of 188 pages in total. It gives the account of 87 poets and the author has related the vivid historical accounts of his period. Most importantly, it describes the social and cultural aspects of life at Lucknow in the nineteenth century in a very interesting manner. The author has not given any title to his work. The present writer has suggested the title *Tazkira-i Shu'ra-i*

Lucknow for this collection.

Key words: Memoir, Biography, Lucknawi Poets, Nassakh, Manuscript.

اردو میں تذکرہ نویسی کی روایت اور اس پر تحقیق و تجزیے کا سلسلہ نیا نہیں۔ اردو کی ادبی تنقید کا آغاز تذکروں ہی سے ہوتا ہے۔ تذکرہ نویسی کی یہ روایت اردو میں فارسی سے داخل ہوئی ہے اور اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی کے وسط تک، چند مستثنیات کے سوا، اردو شعرا کے تذکرے زیادہ تر فارسی زبان ہی میں لکھے جاتے رہے۔ بعد ازاں اردو میں تذکرہ نویسی کی روایت کا آغاز ہوا۔ اردو میں لکھے جانے والے ابتدائی تذکروں میں گلشنِ ہند (میرزا علی لطف ۱۸۰۰–۱۸۰۱ء) تذکرۂ حیدری (حیدر بخش حیدری ۱۸۰۲–۱۸۰۳ء)، انتخابِ دواوین (امام بخش صہبائی ۱۸۴۲–۱۸۴۴ء)، گلدستۂ نازنیناں (کریم الدین ۱۸۴۴–۱۸۴۵ء)، خوش معرکۂ زیبا (سعادت خان ناصر ۱۸۴۴–۱۸۴۶ء)، طبقات الشعراے اردو (کریم الدین، فیلن صاحب ۱۸۴۶–۱۸۴۷ء)، مخزنِ شعرا (نورالدین فائق ۱۸۵۱–۱۸۵۲ء) اور سراپا سخن (سید محسن علی ۱۸۵۲–۱۸۵۳ء) وغیرہ شامل ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں بھی متعدد تذکرے لکھے گئے۔ فرمان فتح پوری صاحب نے اپنے مقالے اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری میں اردو شعرا کے کل اڑسٹھ (۶۸) تذکروں کی فہرست مرتب کی ہے۔[1] اس فہرست میں درج تذکروں میں سے تیس تذکرے اردو میں لکھے گئے ہیں۔ یہ فہرست آب حیات (محمد حسین آزاد، ۱۸۸۰ء) پر ختم ہوتی ہے لیکن آب حیات کے بعد بھی کئی تذکرے لکھے جاتے رہے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ اب بھی اکادکا تذکروں کی دریافت اور تدوین و ترتیب کی خبر ملتی رہتی ہے۔ یہ بات بھی بعید از امکان نہیں کہ ابھی تک نجانے کتنے ایسے تذکرے ہوں گے جو یورپ اور ہندوستان و پاکستان کے کتب خانوں میں قدیم مخطوطات کے انبار میں دبے، اپنی دریافت و نمود کے منتظر ہوں گے۔

ایسا ہی ایک تذکرہ فروری ۲۰۱۳ء میں اوکسفرڈ یونی ورسٹی کے معروف کتب خانے، بوڈلئن لائبریری کے ایک ایسے گوشے میں، جہاں نسبتاً کم معروف مخطوطات کا ایک مختصر سا ذخیرہ موجود ہے، راقم الحروف کے ہاتھ لگا۔ ذیل میں اس قلمی نسخے کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مخطوطے کی ورق شماری کے مطابق یہ نسخہ بڑے سائز کے ۹۴ اوراق (۱۸۸ صفحات) پر مشتمل ہے۔ ورق شماری کا آغاز باب اول کے متن سے ہوتا ہے۔ ابتدائی پانچ اوراق، جن میں فہرست شامل ہے، اس تعداد میں شمار نہیں کیے گئے۔ متن کاغذ کے ایک طرف لکھا گیا ہے۔ اس طرح متن کے کل اوراق کی تعداد ۹۹ ہے۔ ان میں سے آخری دو اوراق خالی ہیں مگر

ان پر نمبر درج کیا گیا ہے۔ نسخے کے درمیان میں بھی چند اوراق خالی ہیں۔ مثلاً نمبر ۶۰ اور ۶۱ خالی ہیں، نمبر ۸۱ اور ۸۲ خالی ہیں اور نمبر ۳۳ پھٹا ہوا ہے۔

مخطوطے کا کاغذ پیلا اور سستی قسم کا ہے۔ فہرست مضامین کو چھوڑ کر باقی تمام متن باریک قط کے قلم اور سیاہ روشنائی سے، خطِ نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ صرف شعرا کے اسما لکھنے کے لیے بڑے قط کا قلم استعمال کیا گیا ہے۔ پہلے چار صفحات پر موٹے قلم سے فہرست مضامین درج کی گئی ہے۔ یہ فہرست کل بارہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں ۹۱ شعرا کے نام درج ہیں تاہم تذکرے کے متن میں ان میں سے چار شعرا کا ذکر موجود نہیں۔ ان میں سے دو تو استاد سرب سنگھ[۲] اور مونس[۳] ہیں، جن کے ناموں کی سرخیاں تو درج کی گئی ہیں مگر ان کے ذیل میں کچھ صفحات خالی چھوڑ دیے گئے ہیں۔ غالباً بعد میں لکھنے کا خیال ہوگا جو پورا نہیں ہو سکا۔ تیسرا نام خلق کا ہے جسے فہرست میں وزیر[۴] کے شاگردوں کی ذیل میں درج کیا گیا ہے۔ اسی ذیل میں آخر میں ایک اور نام ''قلق'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ فہرست کو بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نام کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے۔ تاہم متن میں ''خلق'' کی جگہ ''قلق'' کا حال لکھا گیا ہے۔ غالباً فہرست میں قلق کے بجائے خلق کا اندراج سہو املا کا نتیجہ ہے۔ خلق تخلص رکھنے والے ایک شاعر کا ذکر نساخ نے سخن شعرا میں بھی کیا ہے مگر وہ ''میر احسن خلف و شاگرد میر حسن دہلوی، صاحبِ مثنوی بدر منیر، باشندۂ لکھنؤ''[۵] ہیں۔ معلوم نہیں یہاں جن خلق صاحب کا تذکرہ لکھنا چاہتے تھے وہ یہی ہیں یا کوئی اور۔ چوتھا نام فخر کا ہے جس کا ذکر آخری باب میں شاگردانِ قتیل کی ذیل میں کیا گیا ہے لیکن متن میں فخر کا تذکرہ نہیں ملتا۔

اس تذکرے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس کی ترتیب میں دیگر مروج طریقوں سے قدرے مختلف التزام روا رکھا گیا ہے۔ یہ تذکرہ نہ تو الف بائی ترتیب سے مرتب کیا گیا اور نہ زمانی ترتیب سے؛ بلکہ اس کی ترتیب میں استاد شعرا اور ان کے شاگردوں کے تذکرے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

فہرست کی ترتیب اساتذہ کے نام سے قائم کی گئی ہے اور ہر استاد شاعر کے ذیل میں اس کے شاگردوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تمام شعرا کا تعلق لکھنؤ سے ہے یا کم از کم زندگی کے آخری یا کسی نہ کسی مرحلے پر وہ لکھنؤ میں قیام پذیر رہے ہیں اور یہاں اپنے تلامذہ کا حلقہ پیدا کیا ہے۔

یہ فہرست ذیل میں نقل کی جا رہی ہے کیونکہ اسی سے تذکرے کے متن کی وسعت اور اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

باب اول: استاد مصحفی اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

مصحفی۔ انشا۔ خلیق۔ شہیدی۔ ضمیر۔ ظریف۔ عاقل۔ موجی۔ ہوس۔ گرم۔

باب دوم: استاد آتش اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

آتش۔اصغر۔افضل۔بسمل۔خلیل۔رند۔سرور۔شرر۔شرف۔منتہی۔

باب سوم: استاد صبا اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

صبا۔ریحان۔ازل۔کیف۔ہنر۔

باب چہارم: استاد ناسخ اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

ناسخ۔ آباد۔ آشنا۔ بحر۔ ثاقب۔ رشک۔ آرزو۔ شائق۔ شہید۔ صحبت۔ عرش۔ احقر۔ قبول۔ کیوان۔مسیحا۔

باب پنجم: استاد برق اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

برق۔تسخیر۔احسن۔اشک۔خورشید۔

باب ششم: استاد وزیر اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

وزیر۔خلق۔گویا۔محسن۔تقی۔قلق۔

باب ہفتم: شاعران ریختی گو کے بیان میں

عاشور۔جان صاحب۔خلیل اسحاق۔رنگین۔مخلوق۔نسبت۔

باب ہشتم: استاد سرب سنگھ اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

سرب سنگھ۔پروانہ۔حسرت۔جرات۔قیس۔حقیقت۔

باب نہم: استاد نوازش اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

نوازش۔سرور۔دلگیر۔امانت۔

باب دہم: استاد طوطا رام اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

طوطا رام۔زار یعنی میڈو لال۔شوق۔مقبول۔

باب یاز دہم: شاعران مرثیہ گو کے بیان میں

دبیر۔انیس۔

باب دواز دہم: شاعران متفرق کے بیان میں

جوش۔آصف۔رحمت۔عباس۔اختر واجد علی شاہ۔ذکی۔مونس۔سوز۔فریاد۔بقا۔اختر وفخر، شاگردان مرزا قتیل۔انور علی۔ادراک۔فخر۔اشرف۔

تذکرے کا متن قدیم املا میں لکھا گیا ہے۔ فہرست کے مطابق تذکرے کا مکمل متن اس نسخے میں موجود ہے۔ متنی شہادت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ تحریر ۱۸۸۷ء سے قبل اور ۱۸۷۲ء کے بعد کا ہے۔

تذکرے کے مصنف کا نام پورے متن میں کہیں بھی درج نہیں ہے لیکن ایک ایسی داخلی شہادت مل جاتی ہے جس سے مصنف کا قطعی طور پر تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس شہادت کے مطابق یہ تذکرہ کلکتہ کے معروف شاعر، تذکرہ نویس اور علمی و ادبی شخصیت عبد الغفور نساخ (۱۸۳۴–۱۸۸۹ء) کا تحریر کردہ ہے۔ اس بات کا یقین یوں ہوتا ہے کہ باب دوم میں شاگردانِ آتش کے بیان میں ایک شاعر اصغر کا حال درج ہے۔ نواب ظفر الدولہ علی اصغر خان اودھ کے طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے۔ سقوطِ اودھ کے بعد کچھ مدت کے لیے کلکتہ بھی مقیم رہے تھے۔ شاعری میں آتش کے شاگرد تھے۔ ان کی سوانح بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

اصغر:

تخلص اصغر، ظفر الدولہ معتبر الملک، رفیع الامرا، نواب علی اصغر خان بہادر، ناصر جنگ، وزیر ابو ظفر بہادر شاہ، جنت آرام گاہ دہلی، خلف مولوی علی اکبر، شاگرد خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی، داماد نواب زیر الدولہ [ظہیر الدولہ] بہادر، غلام یحیٰی خان صاحب بہادر وزیر بادشاہ محمد علی شاہ پسر نواب سعادت علی خان بہادر وزیر اودھ، وطن ان کا خاص کشمیر ہے۔ مولد و مسکن خاص لکھنؤ میں ہے۔ نہایت فیاض تھے۔ اکثر شریفوں سے سلوک کرتے تھے۔ اس زمانے میں صدہا آدمی سرکار بادشاہ میں نوکر رکھوا دیے۔ اپنے اہل محلّہ کی نہایت خاطر کرتے تھے۔ ہر وقت شاعروں کی صحبت رہتی تھی، سوائے اس چرچہ کے اور کوئی ذکر زبان پر نہ لاتا تھا۔ ہر مشاعرے میں شریک ہوتے تھے۔ جب سے غدر ہوا اور لکھنؤ کی سلطنت برباد ہوئی، وہ لوگ بھی ان کی صحبت کے نہ رہے، نہ وہ لطف شعر سخن کا رہا۔ شہر کلکتہ میں بہت روز آ کر رہے تھے۔ ہر دو زبان فارسی اور اردو میں شعر ان کا بہت خوب ہوتا تھا۔ عارضہ تپ سے انتقال کیا۔ گیارھویں ۱۱ ذی القعدہ کو ۱۲۷۶ ہجری میں۔ اپنی یادگار میں سے یہ تصنیفات چھوڑ گئے ہیں۔ ایک مثنوی اور ایک جلد دیوان و واسوخت و رباعی۔ راقم نے ان کے انتقال کی تاریخ لکھی ہے۔

شعر

چون علی اصغر شد از دنیا سوے ملک عدم
شد دلِ نساخ محزوں را ز بس رنج و الم
شد بہ یک مصرع دو تاریخ ایں چنیں اے جانِ زار
شنبۂ ذیقعدہ ہے ہے آہ درد و ہائے غم ۱۲۷۶ ہجری

۔۔۔۔۔۔۔فقط

اصغر کے قطعۂ تاریخ میں مصنفِ تذکرہ نے اپنا تخلص ''نساخ'' استعمال کیا ہے۔ اسے پڑھتے ہی دھیان فوراً معروف شاعر و تذکرہ نویس عبدالغفور نساخ کی طرف گیا۔ نساخ بھی کلکتہ کے رہنے والے تھے اور اس تذکرے کے متن میں بھی جا بجا کلکتہ ''آ کر رہنے والے'' شعرا کا حال ملتا ہے، جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ تذکرے کا مصنف کلکتے کا رہنے والا تھا۔

تاہم ابھی یہ شبہ باقی تھا کہ نساخ تخلص رکھنے والا یہ شخص ضروری نہیں کہ عبدالغفور نساخ ہی ہو۔ عین ممکن ہے کہ یہی تخلص کسی اور شخص کا بھی ہو۔استادمحترم پروفیسر گوہر نوشاہی صاحب کی خدمت میں عرض کیا تو انھوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے پہلے تصدیق کر لی جائے کہ یہ وہی نساخ ہیں یا کوئی اور۔ چنانچہ نساخ کی دیگر کتب کی تلاش شروع کی۔ نساخ نے تذکرہ نویسی کے علاوہ تاریخ گوئی میں بھی نام پیدا کیا تھا اور ان کی کہی گئی تواریخ کے ایک سے زیادہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے انھی مجموعوں کی تلاش کی گئی۔ بالآخر استاذی پروفیسر معین الدین عقیل صاحب کی وساطت سے صوابی کی ایک کتاب دوست شخصیت محمد موسیٰ کے نادر ذخیرۂ کتب سے عبدالغفور نساخ کی ایک کتاب گنج تواریخ کے نسخے کا عکس حاصل ہوا جس کے صفحہ نمبر چار پر اصغر کی تاریخ وفات کا قطعہ اس عنوان کے تحت درج ہے:

قطعۂ تاریخ ارتحال نواب علی اصغر خان مرحوم مخاطب بہ ظفر الدولہ متخلص بہ اصغر، باشندۂ لکھنؤ

چوں علی اصغر شد از دنیا سوے ملک عدم
شد دل نساخ محزوں را ز بس رنج و الم
شد بہ یک مصرع دو تاریخ ایں چنیں اے جان زار
شنبۂ ذی قعدہ[۱۲۷۶] ہے ہے، آہ درد و ہائے غم[۱۲۷۶]

گنج تواریخ (لکھنؤ: مطبع نامی، منشی نول کشور)،۴۔

قطعہ دیکھ کر اس امر پر یقین کر لینے میں کوئی شے مانع نہ رہی کہ اس گم نام قلمی نسخے کے مصنف وہی معروف شاعر و تذکرہ نویس عبدالغفور نساخ ہیں جنھوں نے اردو شعرا کا ایک اور ضخیم تذکرہ سخن شعرا کے نام سے لکھا ہے جو ۱۲۹۱ ہجری/ ۱۸۷۴عیسوی میں پہلی بار مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ سخن شعرا کا عکس پروفیسر گوہر نوشاہی صاحب کے کرم سے حاصل ہوا تو بے تابی سے سب سے پہلے اصغر کے نام کا اندراج تلاش کیا۔

سخن شعرا میں اس تخلص کے تحت تین شعرا کا حال درج ہے۔ پہلے دو شعرا کا حال یک سطری ہے اور نمونۂ کلام

کے طور پر پہلے کے دو اور دوسرے کا ایک شعر درج ہے۔ تیسرے اصغر وہی ہیں جن کی تاریخ وفات نساخ نے کہی تھی۔ ان کے حال میں کم و بیش وہی معلومات درج ہیں جو زیرِ نظر مسودے میں ملتی ہیں۔ تاریخ وفات کا مذکورہ قطعہ درج کرنے کے بعد ایک اور قطعہ بھی لکھا گیا ہے جس سے عیسوی سنہ وفات نکلتا ہے۔ یہ عبارت ذیل میں نقل کی جاتی ہے:

اصغر تخلص، ظفر الدولہ، معتبر الملک، رفیع الامرا، نواب علی اصغر خان بہادر ناصر جنگ، وزیر ابوظفر بہادر شاہ، جنت آرام گاہ، پادشاہِ دہلی، خلفِ رشید مولوی علی اکبر، شاگرد خواجۂ آتش، داماد نواب ظہیر الدولہ غلام یحیٰی خان بہادر، وزیر محمد علی شاہ بادشاہ، اودھ وطن ان کا، کشمیر مولد و مسکن، لکھنؤ، کلکتہ میں آ کر بہت روزوں تک رہے۔ آخرش بارہ سو چھہتر ہجری کے گیارھویں ذی قعدہ کو انتقال کیا۔ ہر دو زبان فارسی و اردو میں شعر بہت خوب کہتے تھے۔ راقم کے دوستوں میں تھے۔ صاحبِ مثنوی و دیوان گذرے۔ راقم نے ان کے انتقال کی تاریخ کہی ہے۔

چوں علی اصغر شد از دنیا سوے ملک عدم
شد دل نساخ محزوں را ز بس رنج و الم
شد بہ یک مصرع دو تاریخ ایں چنیں اے جان زار
شنبۂ ذی قعدہ[١٢٧٦] ہے ہے، آہ درد و ہائے غم[١٢٧٦]

ایضاً

قضا کی جو علی اصغر نے اے نساخ
غمیں ہے یہ دلِ مانوس صد حیف آج
کہی ہے آہ میں نے عیسوی تاریخ
علی اصغر موئے افسوس صد حیف آج[١٨٦٠]

اس کے بعد علی اصغر کا نمونۂ کلام درج ہے۔

سخن شعرا کا یہ اندراج اس بات کی مزید شہادت فراہم کرتا ہے کہ اس مسودے کے مصنف دراصل عبد الغفور نساخ ہی ہیں۔

نساخ یکم شوال ۱۲۴۹ ہجری بمطابق گیارہ فروری ۱۸۳۴ عیسوی کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے سوانحی حالات کا سب سے بڑا اور مستند ماخذ ان کی خود نوشت سوانح حیات ہے جو ان کی وفات (۱۳۰۶ ہجری/۱۸۸۹ع) کے وقت ایک قلمی نسخے کی صورت میں موجود تھی اور غالباً ۱۸۸۶ میں کسی وقت مرتب ہوئی تھی۔ قریباً سو برس بعد (۱۴۰۶ ہجری/۱۹۸۶ع) میں مولانا آزاد کالج کلکتہ کے عبد السبحان نے اسے مرتب کر کے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے زیرِ اہتمام شائع کیا۔ اس کے علاوہ ان کے

دیوان دفترِ بے مثال کے مقدمے میں بھی انھوں نے اپنے حالات پر کسی قدر روشنی ڈالی ہے۔[۶] نساخ کے کم و بیش سبھی محققین نے ان کے حالات انھی مآخذ سے حاصل کیے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر اس وقت نساخ کی خودنوشت کے علاوہ دو اور کتابیں بھی موجود ہیں جن میں نساخ کے آثار و کمالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر صدر الحق کا تحقیقی مقالہ ہے جو نساخ۔ حیات و تصانیف کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔[۷] دوسری کتاب نساخ سے وحشت تک سید لطیف الرحمان کی تصنیف ہے جس میں ایک سلسلۂ استادی کے چار بنگالی شعراے اردو کا تذکرہ ہے۔[۸] ایک اور کتاب ہندوستانی ادب کے معمار: عبد الغفور نساخ ہے جو محمد حامد علی خان نے تحریر کی ہے۔[۹] ان کے علاوہ کچھ کتب میں مختصراً نساخ کے خاندانی حالات و آثار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں سے اہم برٹ (F. B. Bradley-Birt) کی کتاب *Twelve Men of Bengal in the Nineteenth Century* ہے جس میں نساخ کے بڑے بھائی نواب عبداللطیف خان کی خدمات کے ذیل میں ان کے خاندان کا تذکرہ ملتا ہے۔[۱۰] تاہم سب سے مفصل اور مستند معلومات کا ماخذ ان کی اپنی خودنوشت ہی قرار پاتی ہے۔

اس خودنوشت کے مطابق نساخ یکم شوال ۱۲۴۹ ہجری بمطابق ۱۱ فروری، ۱۸۳۴ع ،منگل کے روز ،کلکتہ کے محلے کلنگا میں پیرو خانساماں کی گلی میں واقع اپنے والد کے خرید کردہ مکان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منشی قاضی فقیر محمد تھا جو نظامت و عدالت صدر دیوانی کلکتہ میں وکیل تھے اور تاریخ نویسی میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں جامع التواریخ اور منتخب النجوم معروف ہیں۔ وہ دس برس کے تھے کہ ۱۲۵۹ ہجری میں ان کے والدین کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ نساخ کے تین بھائی اور بھی تھے۔ خود نساخ اور نواب عبد اللطیف خان بہادر سی آئی ای وزیر ریاست بھوپال ایک ماں سے تھے جب کہ مولوی عبد المجید اور مولوی عبد الباری دوسری ماں سے۔ نساخ چاروں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

ان کی تعلیمی زندگی کی ابتدا ساڑھے چار برس کی عمر میں مولوی رمیض الدین چاٹگامی کے درس سے ہوئی۔ سات برس کے ہوئے تو مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں داخل ہو گئے۔ اپنی خودنوشت میں انھوں نے اپنے بچپن کے کھیل کود اور شرارتوں کے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔ ۱۸۴۷ میں ان بھائیوں کو تعلیم کے لیے ہوگلی بھیج دیا گیا۔ تاہم نساخ نے اپنی خودنوشت یا دیگر تحریروں میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ انھوں نے کہاں تک تعلیم حاصل کی، کون کون سی اسناد لیں اور کب فارغ التحصیل ہوئے۔ گھر پر آ کر درس دینے والے مولوی صاحبان اور ان کی مار پیٹ کا ذکر البتہ تفصیل سے ملتا ہے۔

۱۸۵۳ میں اپنے بھائی نواب عبد اللطیف خان کے ایما پر انھوں نے ڈھاکا میں دس روپے ماہوار پر محرری کی نوکری

سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے سیکرٹری کپتان سینٹ جارج کے کہنے پر انگلستان سے آنے والے ہندو کالج کے پروفیسر مسٹر ای بی کاول[11] کو فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ مسٹر کاول بہت پڑھے لکھے انسان تھے اور کئی منشیوں سے انٹرویو لے کر انھیں رد کر چکے تھے۔ نساخ نے یہ مرحلہ بخیر وخوبی سر کر لیا اور تیس روپے ماہوار پر ان کی معلّمی اختیار کر لی۔ اس دوران وہ نہ صرف کاول صاحب کے لیے نادر کتب کی فراہمی کا فریضہ بھی سرانجام دیتے رہے بلکہ ایشیاٹک سوسائٹی سے لائی گئی کتابوں کی نقل کا کام بھی کرتے رہے جس سے ان کی آمدنی اور علم دونوں میں خاصا اضافہ ہوا۔ چھے سات ماہ بعد انھیں صدر دیوانی عدالت میں ترجمے کا کام بھی ملنے لگا۔ یہ مشاغل کب تک جاری رہے، اس بارے میں نساخ نے کچھ نہیں لکھا۔ البتہ ۱۸۶۰ میں انھیں کپتان سینٹ جارج کو فارسی پڑھانے کا موقع ملا۔ اسی دوران اپنے برادر بزرگ کے مشورے پر ڈپٹی مجسٹریٹی اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدوں کے لیے درخواست دی اور اکتوبر ۱۸۶۰ میں بریسال میں اس عہدے کا چارج سنبھال لیا۔ اس ملازمت کے دوران وہ بریسال، ہوڑہ، راج شاہی، بانکا، چھپرہ، سلہٹ اور ڈھاکا میں تعینات ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ کم از کم چار بار دہلی اور ایک بار لکھنؤ بھی گئے۔ دہلی میں ان کی ملاقات دیگر شعرا کے علاوہ مرزا غالب (۱۷۹۷–۱۸۶۹) سے بھی ہوئی جنھوں نے ان کی خوب پذیرائی کی۔ ملازمت کے دوران ان کی صحت کی خرابی اور بیماریوں کے حملے انھیں مسلسل زچ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ستاون برس کی عمر میں ۴ شوال ۱۳۰۶ ہجری بمطابق ۱۴ جون ۱۸۸۹ع، بروز جمعہ ان کا انتقال ہو گیا۔

نساخ علم نجوم و رمل[12] اور علم جفر[13] سے بھی واقف تھے۔ خوش نویسی کا بھی شوق تھا اور خط ناخن[14] میں لکھنے کی مشق بہم پہنچائی تھی۔ اس کے علاوہ غالب و مغلوب اور علم شعبدہ سے بھی دلچسپی تھی اور مختلف مواقع پر اس کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔[15]

نساخ نے لکھا ہے کہ وہ سات برس کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ ابتدا میں مولوی رشید النبی وحشت[16] سے دس بارہ غزلوں پر اصلاح لی لیکن استاد کی عدیم الفرصتی کے باعث جب اصلاح ملنے میں تاخیر ہونے لگی تو خود ہی اپنی غزلوں پر محنت کر کے ان کی اصلاح کرنے لگے۔ بعد ازاں اکرام احمد ضیغم[17] سے اصلاح لینے لگے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں شعر وسخن میں کسی استاد کی باقاعدہ اور مسلسل رہنمائی حاصل نہ ہو سکی بلکہ زیادہ تر وہ خود ہی اپنے اشعار میں ترمیم و اصلاح میں مصروف رہے۔[18] مشق سخن کے ابتدائی دنوں میں ہی ایک صاحب خواجہ نبی بخش کشمیری محزوں بصد اشتیاق ان کی شاگردی میں آ گئے جس کے بعد ان کی خود اعتمادی میں بہت اضافہ ہو گیا۔ پھر تو سیکڑوں شاگردوں نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔

ان میں سے کئی صاحبِ دیوان بھی ہوئے۔ ان کے معروف تلامذہ کا حال ڈاکٹر محمد صدر الحق نے اپنے مقالے میں تفصیل سے درج کیا ہے۔انھوں نے پینتیس کے لگ بھگ شعرا کا ذکر کیا ہے جن کا نام تلامذۂ نساخ کے طور پر لیا جا سکتا ہے لیکن چند ایک کی شاگردی کے بارے میں شکوک وشبہات کا ذکر بھی کیا ہے۔[۱۹] ان میں سے بیشتر شعرا کا تذکرہ خود نساخ نے اپنے معروف تذکرے سخن شعرا میں کیا ہے۔

دفترِ بے مثال نساخ کا پہلا دیوان ہے جو ۱۸۶۰ میں مرتب ہوا اور ۱۲۸۰ ہجری، ۱۸۶۳/ ۶۴ عیسوی میں مظہر العجائب پریس کلکتہ سے طبع ہوا۔ اس کا ایک نسخہ غالب کو بھی بھیجا گیا تھا۔ غالب نے رسید کے طور پر نساخ کو جو خط لکھا اس میں اس دیوان کی بہت تعریف کی اور نساخ کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ یہ غالبًا کلکتہ سے جڑی ان کی خوش گوار یادوں کا اثر تھا ورنہ نساخ کے پہلے دیوان میں شامل اشعار شاید اصلاً غالب کی داد کے ایسے مستحق نہ تھے۔نساخ نے ان کلمات کو دوسرے ایڈیشن میں، جو لکھنؤ کے نول کشور پریس سے ۱۸۷۴ میں شائع ہوا تھا، بطور تقریظ شامل کر دیا۔ غالب کی یہ تحریر ان کی عمر کے آخری چند برسوں کی یادگار اور ان کی ذہنی وقلبی کیفیات کی ترجمان ہے۔ لکھتے ہیں:

> جناب مولوی صاحب قبلہ! یہ درویش گوشہ نشین جو موسوم بہ اسد اللہ اور متخلص بہ غالب ہے، کرمتِ حال کا شاکر اور آئندہ افزایش عنایت کا طالب ہے۔ دفترِ بے مثال کو عطیۂ کبریٰ اور موہبتِ عظمیٰ سمجھ کر یاد آوری کا احسان مانا۔ پہلے اس قدر افزائی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے اس ہیچ مدان کو قابلِ خطاب اور لائق کتاب جانا۔ میں دروغ گو نہیں۔ خوشامد میری خو نہیں۔ دیوان فیض عنوان اسم بامسمیٰ ہے۔ دفتر بے مثال اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند۔ ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق میں بے باک لوگ ہیں۔ شیخ امام بخش ناسخ طرز جدید کے موجد اور اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔ آپ ان سے بڑھ کر بہ صیغۂ مبالغہ، بے مبالغہ نساخ ہیں۔تم دانائے رموز اردو زبان ہو، سرمایۂ نازش قلم رو ہندوستان ہو۔ خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان ہی میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔نظم ونثر فارسی کا عاشق اور مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا، فارسی زبان میں بہت کچھ بکا۔ اب نہ فارسی کی فکر، نہ اردو کا ذکر۔ نہ دنیا میں توقع، نہ عقبیٰ کی امید۔ میں ہوں اور اندوہِ ناکامیِ جاوید۔ جیسا کہ خود ایک قصیدۂ نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں:
>
> چشم کشودہ اند بکردار ہاے من
>
> ز آیندہ ناامیدم و از رفتہ شرمسار

ایک کم ستر برس دنیا میں رہا۔ اب اور کہاں تک رہوں گا۔ ایک اردو کا دیوان، ہزار بارہ سو بیت کا، ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا، تین رسالے نثر کے، یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا کہوں گا۔ مدح کا صلہ نہ ملا، غزل کی داد نہ پائی۔ ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی۔ بقول طالب آملی رحمۃ اللہ علیہ:

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود، بہ شد

سچ تو یہ ہے کہ قوت ناطقہ پر وہ تصرف اور قلم میں وہ زور نہ رہا۔ طبیعت میں وہ مزا، سر میں وہ شور نہ رہا۔ پچاس پچپن برس کی مشق کا ملکہ کچھ باقی رہ گیا ہے، اسی سبب سے فن کلام میں گفتگو کر لیتا ہوں۔ حواس کا بھی بقیہ اسی قدر ہے کہ معرض گفتار میں موافق سوال کے جواب دیتا ہوں۔ روز و شب یہ فکر رہتی ہے کہ دیکھیے وہاں کیا پیش آتا ہے اور یہ بال بال گناہ گار بندہ کیوں کر بخشا جاتا ہے۔ حضرت سے یہ التماس ہے کہ آپ جو ۔۔۔۔[؟] اور مجھ کو ارسال نامہ کی سبیل کے ہادی ہوئے ہیں، جب تک میں جیتا رہوں، نامہ و پیام سے شاد اور بعد میرے مرنے کے دعاے مغفرت سے یاد فرماتے رہیے گا۔[۲۰]

اس دیوان کا ذکر فرانسیسی مستشرق گارسیں دتاسی (۱۷۸۴–۱۸۷۸) نے اپنے چودھویں خطبے (۱۸۶۴) میں کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے دیوان کے عنوان دفتر بے مثال اور شاعر کے تخلص نساخ کو سراہا اور ان کے مبنی برحقیقت ہونے کی تصدیق کی ہے جب کہ گارسیں دتاسی نے ان دونوں باتوں کو شاعر کی خود پسندی اور انکسار سے گریز پر محمول کیا ہے۔ دراصل گارسیں دتاسی اس تہذیبی و ثقافتی روایت سے لاعلم تھے جو اردو شاعری میں تعلّی کی صورت میں موجود تھی اور جسے قبیح نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

ایک دوسری کتاب دفتر بے مثال مجھے بھیجی گئی ہے۔ اگرچہ اس کتاب کا نام ایسا ہے کہ اس سے پہلے پہل آدمی دھوکے میں پڑ جاتا ہے لیکن یہ دراصل کلکتہ کے ایک معزز مسلمان کے اشعار کا انتخاب ہے۔ شاعر کا نام مولوی عبد الغفور ہے اور وہ نساخ تخلص کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ تخلص بھی انکسار کے خیال سے اسی قدر دور ہے جتنا خود کتاب کا نام۔ یہ کتاب اسی سال طبع ہوئی ہے اور ۱۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ نساخ کلکتہ کے مشہور و معروف عبد اللطیف خان بہادر کے قریبی رشتہ دار ہیں۔(۲۱) انھوں نے فرید الدین عطار کے پند نامہ کا اردو نظم میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس بیاض میں بعض بعض اچھے خاصے شعر ملتے ہیں ۔۔۔۔ نساخ نے بعض بعض جگہ ذوق کا جواب لکھا ہے۔ ذوق اس وقت ہندوستان کے بہترین شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لیے انھیں خاقانیِ ہند کا خطاب ملا ہے۔[۲۲]

دفتر بے مثال کے علاوہ نساخ کے تین اور دیوان شائع ہوئے۔ اشعار نساخ کے عنوان سے ۹۴ صفحات پر

مشتمل ان کا دوسرا دیوان منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۸۷۴ میں شائع ہوا۔ تیسرے دیوان کا نام ارمغان ہے جو پہلی بار مطبع نظامی کانپور سے ۱۸۷۷ میں شائع ہوا اورکل ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۸۸۶ میں مطبع نامی لکھنؤ سے ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ان کا چوتھا دیوان ارمغانی کے نام سے شائع ہوا۔ یہ تمام نام تاریخی ہیں لیکن ان سے سالِ ترتیب حاصل ہوتا ہے، سال اشاعت نہیں۔ اسی لیے ان کے بعض نقادوں نے انھی تاریخوں کو سالِ اشاعت قرار دیا ہے لیکن محمد صدر الحق صاحب نے ہر دیوان کی اشاعت کے قطعہ ہاے تاریخ بھی ڈھونڈ نکالے ہیں جن کی مدد سے قطعی طور پر تعین کیا گیا ہے کہ ان کتب کے سال اشاعت کیا تھے۔[۲۳]

ان چاروں دیوانوں کے مطالعے سے دو باتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ابتدائی دور میں نساخ لکھنوی بالخصوص ناسخ کے رنگِ سخن سے متاثر تھے اور ان کے بیشتر اشعار ناسخ ہی کے رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ ان کا تخلص نساخ بھی ناسخ سے ان کے ذہنی ربط کا پتا دیتا ہے۔ اگرچہ محققین نے اس باب میں کئی نکتہ طرازیاں کی ہیں اور ان کے تخلص کو کہیں ناسخ سے تقابل اور عداوت کا نتیجہ قرار دیا ہے اور کہیں ان سے متاثر ہونے کا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ دونوں باتیں قیاس پر مبنی ہیں اور دونوں کا کوئی مسکت ثبوت دستیاب نہیں ہوتا۔ نساخ کی خودنوشت کے مطالعے سے لکھنوی شعرا بالخصوص ناسخ سے ان کی رنجش یا بغض کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ زیرِنظر تذکرے میں بھی انھوں نے ناسخ کو کھل کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ ان کے دورِ حیات میں واجد علی شاہ کے قیام کے باعث کلکتہ لکھنوی شعرا کا مرکز بن گیا تھا اور مٹیا برج میں ہونے والے مشاعروں کی دھوم پورے شہر میں تھی۔ اس تناظر میں کلکتے کے شعرا کا لکھنوی طرزِ شعر گوئی سے متاثر ہونا فطری امر ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان کے چاروں شعری مجموعوں کے مطالعے سے ان کے شعر گوئی کے رجحانات میں آنے والی تبدیلیاں بھی واضح دکھائی دیتی ہیں۔ ایک تبدیلی تو رنگ سخن کی ہے جو لکھنوی انداز سے ہٹ کر دہلوی انداز اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے اور دوسری تبدیلی اصناف کی ترجیح سے متعلق ہے۔ پہلے مجموعے کے پہلے ایڈیشن میں غزلیات کی تعداد تین ہزار پانچ سو انچاس ہے۔ کچھ تاریخی قطعات بھی ہیں جو اعزہ و اقربا کے سال وفات وغیرہ سے متعلق ہیں۔ دوسرے دیوان میں غزلیات کے علاوہ قطعات، رباعیات، معمیات اور ایک نامکمل قصیدہ بھی شامل ہیں۔ تیسرے اور چوتھے دیوان میں تاریخی قطعات کی تعداد اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نساخ کی طبیعت آہستہ آہستہ غزل گوئی سے ہٹ کر تاریخی قطعات مرتب کرنے کی طرف مائل ہو چکی تھی۔ چنانچہ ان کے دیگر مجموعے بیشتر تاریخی قطعات پر مشتمل ہیں اور غزلیات و رباعیات وغیرہ کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ ان مجموعوں میں سراپاے سراپا تماشا، جو اپنے تاریخی نام شاہد عشرت سے زیادہ

معروف ہے،۱۸۷۴ میں دوسرے دیوان کی اشاعت کے بعد مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اسی سال انھوں نے اپنی فارسی رباعیات کا مجموعہ مرغوبِ دل بھی مرتب کیا۔ گنج تواریخ (مرتبہ۱۸۷۳–۷۴)، کنز التواریخ (مرتبہ ۱۸۷۷–۷۸) اور باغ فکر المعروف بہ مقطعات نساخ (مطبوعہ مطبع نامی لکھنؤ، ۱۸۸۷) ان کے تاریخی قطعات کے مجموعے ہیں۔ ان میں سے بیشتر مجموعے معروف اردو ویب گاہ ''ریختہ'' پر موجود ہیں۔[۲۴] ان مجموعوں سے نہ صرف نساخ کے خاندان، آبا و اجداد اور اعزہ و اقربا کے احوال کا علم ہوتا ہے بلکہ اس دور کی اہم شخصیات اور واقعات کے بارے میں بھی مستند معاصر شہادتیں دستیاب ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے نساخ کے تاریخی قطعات ان کی شاعری سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

تاریخی قطعات کے مجموعوں کے علاوہ ان کے معموں کا ایک مجموعہ مظہر معما کے نام سے ۱۳۰۲ ہجری (۱۸۸۴–۸۵) میں مطبع بحرالعلوم کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ۳۹ معمے درج ہیں جن میں سے ۲۹ فارسی میں اور دس اردو میں ہیں۔ ترانۂ خامہ عرف مرغوبِ جان ان کی اردو رباعیات کا مجموعہ ہے جو۱۸۸۴–۸۵ ہی میں مرتب ہو کر کلکتہ سے شائع ہوا۔ ۱۸۸۵–۸۶ میں انھوں نے نصرۃ المسلمین کے عنوان سے رد وہابیت کے مقصد کے تحت ایک مختصر رسالہ لکھا جس میں مومن (۱۸۰۰–۱۸۵۱) کی ان رباعیات کا جواب دیا گیا جس میں مقلدین پر چوٹ کی گئی ہے۔ اس سے پہلے وہ فرید الدین عطار (۱۱۴۵–۱۲۲۰) کے پند نامہ کا منظوم ترجمہ چشمۂ فیض کے عنوان سے کر چکے تھے جو کلکتہ میں ۱۸۶۲ میں طبع ہوا تھا۔

شعری کاوشوں کے علاوہ نساخ کی عظمت کا ایک عنوان ان کی نثر بھی ہے۔ یوں تو نظم کی طرح نثر کے میدان میں بھی ان کی جولانی طبع مختلف میدانوں میں اپنے جوہر دکھاتی ہے لیکن ان کا ایک بڑا حوالہ تذکرہ نویسی کا ہے۔ ان کی زندگی میں ترتیب پانے اور معروف ہونے والے تذکروں کی تعداد تین ہے۔ چوتھے تذکرے کو نیم تذکرہ کہنا بجا ہوگا کیوں کہ یہ بیاض اور تذکرے کی درمیانی صورت ہے۔ زیر بحث تذکرے کو شامل کریں تو یہ تعداد پانچ ہو جاتی ہے۔

سخن شعرا نساخ کا معروف ترین تذکرہ ہے جو اردو شاعروں کے بیان پر مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ جنوری ۱۸۶۵ میں مرتب ہوا اور تقریباً دس سال بعد۱۸۷۴ میں منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس تذکرے میں تقریباً ڈھائی ہزار شعرا کا ذکر ہے جن میں انتالیس شاعرات بھی شامل ہیں۔ گارسیں دتاسی کی تاریخ ادب ہندوستانی کے بعد سب سے زیادہ تعداد میں شعرا کا ذکر اسی تذکرے میں ملتا ہے۔ نساخ نے اپنے تذکرے میں اپنے دور تک معروف ہونے والے تمام اہم اور بہت سے غیر اہم شعرا کا ذکر اجمالاً کیا ہے اور یہی اس کی اہمیت کا باعث ہے کہ اس میں ان شعرا کا ذکر بھی مل جاتا

ہے جنھیں دوسرے تذکرہ نویسوں نے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ تاہم شعرا کے حالات زندگی نہایت مختصر اور بعض صورتوں میں غیر مستند ہیں۔ نمونۂ کلام کے طور پر البتہ طویل کلام درج کیا گیا ہے۔ کلام پر رائے کا اہتمام بھی بہت کم ہے۔ بعض شعرا کا تذکرہ تو محض ایک جملے اور ایک شعر پر مشتمل ہے۔

ان کا دوسرا اہم تذکرہ قطعۂ منتخب کے تاریخی نام سے ۱۸۷۴ میں مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔ تذکرے کا اصل نام تذکرۂ شعرامے زبان اردوے معلیٰ ہے۔ اس میں صرف ان شعرا کو شامل کیا گیا ہے جو قطعات کہتے تھے۔ کل ۶۰ شعرا اس تذکرے میں شامل ہیں۔ تاہم یہ تمام شعرا سخن شعرا میں شامل ہیں اور ان کے احوال کم وبیش وہی ہیں جو سخن شعرا میں درج ہیں۔ کہیں کہیں البتہ سخن شعرا کی نسبت زیادہ تفصیل مل جاتی ہے۔ اس مجموعے کا اصل مقصد تذکرہ لکھنا نہیں بلکہ اہم شعرا کے قطعات جمع کر کے انھیں ردیف وار مرتب کرنا ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ سخن شعرا کے بعد مرتب ہوا لیکن اس کا سال اشاعت وہی ہے جو سخن شعرا کا ہے؛ اس لیے بعض محققین نے اسے نساخ کا پہلا تذکرہ قرار دیا ہے۔ ابتدائی کلمات میں نساخ لکھتے ہیں:

> ۔۔۔ ایک دن مجمعِ احباب میں ہر قسم کے شعر پڑھے جاتے تھے، اس میں خیال آیا کہ اگر شعرائے متقدمین و متاخرین زبان ریختہ کے مقطعات عمدہ جہاں تک دست یاب ہوں، بقید ردیف جمع کیے جائیں اور تخلص اور نام و نشانِ شاعر بھی بقید حروف تہجی ہر ردیف میں تحریر پائیں تو ایک معقول یادگار رہ جائے گا کہ کسی نے آج تک ایسا تذکرہ جمع کیا نہیں۔[۲۵]

یوں اس مجموعے میں نساخ نے قریباً ساڑھے پانچ سو قطعات جمع کر لیے اور اس کی ترتیب تذکرے کے موافق رکھی کہ پہلے شاعر کے حالات درج کیے جائیں اور اس کے بعد قطعات۔

نساخ کا تیسرا تذکرہ تذکرۃ المعاصرین ہے۔[۲۶] محمد صدر الحق کے مطابق اس تذکرے کا صرف ایک نسخہ انھیں دستیاب ہوسکا۔ یہ واحد نسخہ ڈھاکا یونی ورسٹی میں موجود ہے اور نساخ کی وفات (۱۴ جون ۱۸۸۹) کے بعد، ۱۸۹۱ میں شائع ہوا ہے۔ تذکرۃ المعاصرین فارسی میں لکھا گیا ہے اور برصغیر کے فارسی گو شعرا کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس میں شعرا کا بیان ردیف وار کیا گیا ہے اور ''ع'' کی ردیف تک شعرا کا حال ملتا ہے۔ اگرچہ ''ع'' کے تحت یہ بیان درج ہے کہ اس ذیل میں ۳۶ شعرا کا حال بیان کیا گیا ہے مگر موجود نسخے میں صرف پندرہ شعرا کا حال ملتا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ نسخہ نامکمل ہے۔

اس نامکمل صورت میں بھی یہ برصغیر بالخصوص بنگال کے فارسی گو شعرا کا ایک نادر تذکرہ ہے اور اس میں کئی ایسے شعرا

کا حال ملتا ہے جن کا ذکر کسی اور کتاب میں دستیاب نہیں۔ اس تذکرے میں پہلے دونوں تذکروں کی نسبت شعرا کے بارے میں زیادہ معلومات دی گئی ہیں۔ مثلاً واجد علی شاہ کے بارے میں دو صفحات تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ واضح نہیں ہوتا کہ تذکرے کا نام خود نساخ نے تجویز کیا تھا یا ان کی وفات کے بعد مرتب نے یہ نام رکھ دیا۔ تاہم اپنے مندرجات کے اعتبار سے یہ تذکرہ نساخ کے اہم کارناموں میں سے ایک شمار ہوتا ہے۔

ان تین تذکروں کے علاوہ قند پارسی کے عنوان سے ایک تذکرہ نما بیاض بھی نساخ کی یادگار ہے۔ اس بیاض میں فارسی گو شعرا کے کلام کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔ شعرا کا نام ردیف وار درج ہے جو اس بیاض کو تذکرے کی صنف سے قریب تر کرنے کا باعث ہے لیکن چونکہ اس میں صرف کلام دیا گیا ہے، احوال نہیں، اس لیے اسے مکمل تذکرہ نہیں کہا جا سکتا۔ ۱۱۸ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۷۲ میں شائع ہوا تھا۔

تذکروں کے علاوہ نساخ کی متعدد دیگر تصانیف بھی موجود ہیں جن میں سے بیشتر کی نوعیت مختصر رسالوں کی سی ہے۔ ان میں میرزا وصال شیرازی کے فارسی کلام کا انتخاب سفینۂ منتخب، نامی پریس لکھنؤ سے اپریل ۱۸۸۸ میں شائع ہوا۔ زبان ریختہ کے نام سے سولہ صفحات پر مبنی ایک رسالہ ۱۸۷۴ میں لکھنؤ سے شائع ہوا جس میں اردو زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقا پر بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح کلکتہ یونی ورسٹی کے لیے ''نصاب اردو زبان، حصہ دوم (حصہ نظم)'' بھی ترتیب دیا جو ۱۸۶۴ کے امتحان کا نصاب مقرر ہوا۔ ان مختصر کتابوں میں سے اہم ترین انتخابِ نقص ہے جس میں انھوں نے ''میرزا دبیر اور میر انیس کے کلام کی زبان، عروض، محاورے، معانی اور قواعد وغیرہ کی غلطیاں اور بعض دوسرے فنی نقائص''[۲۷] دکھائے ہیں۔ یہ رسالہ ۱۸۷۸ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ لکھنؤ کے شعرا کے ہاں اس کا شدید ردعمل پیدا ہونا یقینی تھا لہٰذا یہ کتاب ایک بڑے ادبی معرکے کا محرک بن گئی اور اس کے جواب میں رسالے لکھے گئے۔ تاہم مولانا شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں نساخ کے اٹھائے ہوئے بیشتر اعتراضات کو درست قرار دیا ہے۔ اس کتاب سے نساخ کی لسانی مہارت اور عروض و بلاغت پر دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔

نساخ کے تذکرۃ المعاصرین کی طرح ان کی خود نوشت سوانح حیات بھی ادھوری ہی رہ گئی۔ یہ خود نوشت ۱۸۸۵ تک کے واقعات پر مشتمل ہے اور غالباً ۱۸۸۶ کے اوائل میں مرتب ہوئی ہے۔ تاہم اس کی پہلی اشاعت سو سال بعد ۱۹۸۶ میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے زیر اہتمام ہوئی۔ اس قلمی نسخے کا یہ تنقیدی ایڈیشن مولانا آزاد کالج کلکتہ کے استاد زبان و ادبیات فارسی ڈاکٹر عبدالسبحان نے ترتیب دیا ہے۔ یہ قلمی نسخہ ایک ادھورے جملے پر ختم ہو جاتا ہے۔

نساخ کی تمام تصانیف کا تذکرہ ان کے نقادوں اور محققین نے کیا ہے۔مگر راقم الحروف کو حاصل شدہ قلمی نسخے کا تذکرہ کسی کتاب میں نہیں ملتا اور نہ ان کی خود نوشت سے ایسا کوئی اشارہ ملتا ہے کہ وہ لکھنوی شعرا کا کوئی ایسا تذکرہ لکھ رہے تھے جس میں اساتذہ اور ان کے تلامذہ کا بیان ہو۔ ان کی خود نوشت ان کے ادبی کارناموں سے زیادہ ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات، مقدموں اور ان کے فیصلوں کی تفاصیل اور سیر و سفر کے احوال پر مبنی ہے۔ تاہم ان کی متنوع دلچسپیوں کو دیکھتے ہوئے اور ان کی طبیعت کی جولانی اور اپچ کے پیش نظر یہ امر کچھ بعید از امکان معلوم نہیں ہوتا کہ انھوں نے لکھنوی شعرا کا ایک ایسا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کرلیا ہو جس میں مختصر احوال کے بجائے نہایت تفصیل سے ہر شاعر کی سوانحی معلومات اور دیگر تفاصیل درج کی جائیں۔

زیر نظر تذکرہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان کے تمام دیگر تذکروں سے مختلف ہے۔سب سے پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ اس تذکرے میں ایک خاص ترتیب روا رکھی گئی اور اسے اساتذہ کے ناموں سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہر باب میں ایک استاد شاعر اور اس کے تلامذہ کا ذکر ہے۔ اس ترتیب میں تقدیم و تاخیر کے لیے کیا معیار قائم کیا گیا ہے، اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ اساتذہ کا بیان ان کی اہمیت کے اعتبار سے کیا گیا ہوگا۔ یا پھر ہوسکتا ہے کہ زمانی ترتیب کا التزام رکھا گیا ہو۔ تاہم اس سلسلے میں مصنف کا موقف واضح نہیں ہوتا۔

دوسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ تذکرہ ایک خاص علاقے یعنی لکھنؤ سے وابستہ شعرا تک محدود ہے۔ تیسرا اور اہم وصف یہ ہے کہ اس میں پہلے تذکروں کے برعکس، نمونۂ کلام کی ذیل میں دیے گئے اشعار کی نسبت احوال کا حصہ طویل اور مفید ہے۔ اس حصے میں مختلف دلچسپ واقعات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ چوتھا وصف یہ ہے کہ اس تذکرے میں شعرا کی سوانحی معلومات ہی نہیں ملتیں بلکہ اس عہد کی سماجی و معاشرتی زندگی بھی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

یہ اس دور کے تمام تر تذکروں کی طرح محض شعرا کے نام اور ان کے بارے میں مجمل معلومات اور نمونۂ کلام پر مشتمل نہیں بلکہ مفصل حالات زندگی اور اس عہد کے سماجی وقائع کے بیان پر مشتمل ہے۔کل ۸۷ شعرا میں سے صرف ۳۰ شعرا کے کلام کا نمونہ دیا گیا ہے۔ یہ بھی عام طور پر ایک غزل یا چند اشعار پر مشتمل ہے۔لیکن تذکرے میں شامل شعرا ہمیں اپنی جیتی جاگتی اور زندہ شخصیت کے ساتھ چلتے پھرتے اور زندگی کی مختلف النوع مہمات سے نبرد آزما ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے سماجی مشاغل، تہوار، کھیل، کرتب، لباس، نشست و برخاست کے قرینے، میل جول کے آداب، مصروفیاتِ زندگی اور اخلاق و اقدار کے مرقعے جا بجا اس تذکرے میں بکھرے ہوئے ہیں۔

تذکرے کا اسلوب بہت دلچسپ اور علمی سے زیادہ حکائی ہے۔ اس میں کہانی کی سی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور شاعروں کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر مصحفی کے بیان میں لکھا ہے:

> آخر کو یہ نوبت ہوئی کہ میر [انشاء] اللہ خان نے ان کی ہجو کی اور میاں مصحفی نے انشاء اللہ خان کی ہجو کی اور ایک دن اس کے پڑھنے کا مقرر ہوا۔ تمام شہر کو اشتیاق تھا۔ میر انشاء اللہ خان صاحب نے ہر کوچہ بازار میں اشتہار لگا دیے کہ جس شخص کو سننا ہو خان صاحب بہادر کے مکان پر آئے، بعد دوپہر کے جلسہ ہوگا۔ دن مقرر جب آیا، ہر ایک آدمی اپنے مکان سے دو گھڑی پیشتر چل نکلا۔ چند عرصے کے بعد غل ہوا کہ میاں مصحفی مع شاگردان اور صدہا آدمی کا مجمع ساتھ ہے اور ڈنڈے بجتے چلے آتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج روز ہولی [ہے] جب مکان پر میر انشااللہ خان کے پہنچے، میر صاحب اپنے مکان سے دیوان خانے میں آئے اور میاں مصحفی کو نہایت اس دن خوشی حاصل تھی۔ میر انشااللہ خان اپنے دیوان خانے میں آئے۔ ان سب صاحبوں کو بٹھایا اور ہر ایک طرح کی خاطر سے پیش آئے۔ آخرش شائق جو لوگ اس کلام کے ہو کے آئے، انھیں نے میاں مصحفی سے یہ بات عرض کی، اب آپ کو کس کا انتظار ہے۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ میر انشااللہ خان سے دریافت فرمایئے، جب وہ ارشاد کریں گے اس وقت ہم شروع کریں۔ ہم کو کچھ پڑھنے میں کسی طرح کا انکار نہیں۔ لوگوں [نے] جا کر میر انشااللہ خان سے عرض کیا، کیا عرصہ کا باعث ہے۔ یہ بات سن کے میر انشااللہ خان خود صحبت میں جا کر بیٹھے اور کہا کہ میاں مصحفی! بسم اللہ! یہ کلمہ وہ سن کے ہجو پڑھنے لگے۔ بلور کی گردن اور انگور کی گردن، خان صاحب مذکور بھی خود ہر شعر پر تعریف کرتے تھے۔ لوگ تمام ہنستے ہنستے بے تاب ہو گئے تھے۔ اس طرح کا جلسہ کہیں شہر میں نہیں ہوا تھا، پہر بھر شعر خوانی رہی؛ بعد اس کے وہ مکان پر تشریف لے گئے۔ انشاء اللہ خان صاحب کے شاگردوں نے عرض کیا کہ آپ کوئی ہجو میاں مصحفی کی شان میں ارشاد فرمائیں اور آپ بھی اسی انداز سے ان کے مکان پر چلیے تا کہ ان کی ہجو کہنے کا مزاح [مزا] یاد رہے۔ خان صاحب نے کہا کہ بہت خوب۔ دس پندرہ روز کے زمانہ میں خان صاحب نے میاں مصحفی کی ہجو نہایت عمدہ لکھی اور اپنے چلنے کا دن میاں مصحفی کے مکان پر مقرر کیا اسی طرح تمام شہر کو خبر دی کہ فلاں روز میر انشااللہ خان ہجو پڑھتے ہوئے میاں مصحفی کے مکان پر جائیں گے۔ یہ سن کے ہزار ہا آدمی ان کے ساتھ تھا۔ غرض میاں مصحفی کے گھر پر جا پہنچے۔ میاں صاحب نے اسی طرح ان صاحبوں کی خاطر کی اور حکم دیا کہ ہجو پڑھیے۔ یہ سن کے میر انشاء اللہ خان صاحب نے مع شاگردوں [کے] بہ آواز بلند پڑھنا شروع کیا۔ بہت لوگ خوش ہوئے اور بعض بعض ناراض ہوئے۔ اسی صورت پر ایک پہر صحبت رہی۔ پھر برخاست ہوئی۔ ہر کارے جو سلطانی وہاں مقرر تھے، نواب صاحب کو اس مضمون کا پرچہ لکھا کہ نواب صاحب اس پرچہ کو پڑھ کر نہایت ناراض ہوئے اور مصحفی کے بارے میں حکم ہوا کہ ابھی اس کو ہمارے شہر سے نکال دو۔ انشاء اللہ خان نے نواب صاحب سے عرض کیا

کہ خانہ زاد بھی میاں مصحفی کے ہمراہ جائے گا۔ یہ سن کے نواب نے حکم موقوف رکھا۔ میر انشاء اللہ خان کے تو شاگرد میاں مصحفی کی ہجو ہر گلی کوچہ و بازار میں پڑھتے تھے۔ میاں مصحفی جو ہجو میر انشاء اللہ خان کی کہتے تھے، کوئی شاگرد مارے خوف کے پڑھ نہ سکتا تھا۔ اس غم میں میاں مصحفی بیمار ہوئے اور مارے ندامت کے مکان سے باہر نہ آتے تھے۔ جو شخص ملاقات کو ان کے پاس آتا کہیں میاں صاحب اپنا حال لکھ کے بتا دیتے تھے۔ وہ پڑھ کے نہایت رنج کرتا تھا۔ میر انشاء اللہ خان کا زمانہ تھا۔ کچھ زور کسی کا نہ [چل] سکتا تھا۔ بجز خموشی اور نہ کوئی امر [میں] دخل دیتے تھے۔

اسی طرح ضمیر کے بیان میں لکھتے ہیں:

تخلص ضمیر، میر مظفر حسین، خلف میر قادر علی، شاگرد غلام ہمدانی تخلص مصحفی، باشندہ لکھنؤ محلّہ نواب گنج، متصل مکان صمصام الدولہ بہادر، برادر نواب نادر مرزا صاحب مرحوم، بزرگ ان کے قدیم رہنے والے نجف اشرف کے تھے جہاں حضرت علی دفن ہیں۔ بادشاہ عالمگیر ثانی کے زمانے میں دہلی میں تشریف لائے تھے۔ قریب لاہوری دروازہ کے مقیم ہوئے، صوبہ دار دکھن کے ہوئے۔ بہت عرصہ تک اس علاقے میں رہے۔ وہی عہدہ ان کے خاندان میں چلا گیا۔ ایک مدت تک زمانہ نواب شجاع الدولہ بہادر مرحوم کے، فیض آباد میں آئے۔ ان کے والد نے نواب صاحب کو عرض کی کہ ہمارے بزرگ اس سرکار فیض آثار کے قدیم نمک خوار ہیں۔ حضور کا فیض سن کے مع عیال و اطفال حاضر ہوئے ہیں۔ اس وقت میں سوائے آپ کی سرکار کے کہاں جائیں۔ اس وقت ان کی عرضی پر یہ مضمون دست خط ہو گیا کہ اگر آپ کو منظور ہو تو ایک رسالداری خالی ہے، کر لیجیے۔ ان کے والد مرحوم نے منظور کیا۔ سرکار سے خلعت رسالداری کا ہو گیا۔ کار سرکار بدستور کرنے لگے۔ تو ان کے دوستوں نے ایک دن یہ کہا کہ میر صاحب ایک مکان یہاں بنائیے، سرکاری مکان میں کب تک گذر کیجیے گا۔ اس وقت انھوں نے ایک عمدہ مکان تعمیر کیا۔

نواب آصف الدولہ بہادر مرحوم کے ساتھ لکھنؤ میں تشریف لائے، اس روز سے باشندہ لکھنؤ مشہور ہوئے۔ نواب سعادت علی خان مرحوم کے زمانہ میں میر ضمیر صاحب پیدا ہوئے۔ سولہ برس تک علم حاصل کیا۔ بیس برس کے سن میں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ زمانہ سودا اور میر حسن، میر محمد تقی، مرزا تقی ہوس کا تھا۔ یہ اس زمانے میں میاں مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ ان سب مصاحبوں کے ساتھ مشاعرے کرتے تھے۔ اس وقت کے شاعروں کا یہ دستور تھا کہ ڈنڈوں پر شعر پڑھتے تھے سر بازار۔ جس طرح ہولی میں سونگ کے ساتھ اب تک لوگ شعر پڑھتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ ایک شاعر کی ایک شاعر ہی ہجو پڑھتا تھا اور شرم و حیا کسی کی آنکھ میں نہ تھی۔ یہ رنگ دیکھ کر ضمیر نے شعر گوئی کو ترک کیا اور مرثیہ گوئی کی طرف مخاطب ہوئے۔ پہلے تو سلام سو دو سو کے [قریب] مرتب فرمائے۔ جب اس سے فارغ ہوئے، تب مرثیے تصنیف بہت سے کیے۔

اس زمانے میں نواب میر اکرام اللہ خان مرحوم کے امام باڑہ میں مجلس ہوتی تھی۔ نہایت عمدہ لوگوں نے نواب صاحب مرحوم سے ان کی تعریف کر کے کہا کہ حضور میر ضمیر صاحب مرثیہ خوب فرماتے ہیں اور نہایت اچھا پڑھتے ہیں۔ نواب صاحب مرحوم نے یہ کلمہ سن کے میر صاحب کو طلب کیا کہ یہ اپنے مکان سے مع شاگرد مجلس امام حسین علیہم السلام میں تشریف لائیں۔ نواب صاحب نے نہایت خاطر کی۔ اس قدر لوگوں کو ان کے سننے کا اشتیاق تھا کہ کار ضروری چھوڑ کر آئے تھے اور اس طرح کا امام باڑہ میں مجمع تھا کہ لوگوں کو کہیں بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ دوپہر کو یہ منبر پر مرثیہ پڑھنے گئے تھے۔ وہ مرثیہ یہ تھا:

جب مشک بھر کر نہر سے عباس غازی گھر چلے

پہلے تو مرثیہ کا چہرہ پڑھا، بعد چہرے کے لڑائی پڑھی، بعد لڑائی کے شہادت پڑھی۔ اس قدر لوگ خوش ہوئے کہ ایک عالم کی شاعری بھول گئے اور یک قلم خاص و عام ان کی تعریف کرتے تھے۔ تین گھڑی کے زمانہ تک منبر پر مرثیہ پڑھا، جب منبر پر سے یہ اترے تو ہر خاص و عام نے ان کے ہاتھ چوم لیے اور ان کے قدم کو آنکھوں سے لگایا۔ جب رونے سے نواب اکرام اللہ خان فارغ ہوئے، اس وقت ضمیر کو سترہ پارچہ کا خلعت عنایت ہوا اور دو ہزار روپیہ نقد۔ اس امام باڑہ میں یہ مقرر ہوگئے اور تنخواہ بھی پچاس روپیہ ماہواری کی مقرر ہوئی۔ ان کی مرثیہ خوانی کی تمام شہر میں اس دن سے دھوم ہوئی۔

مرزا دبیر اس زمانے میں سلام لکھتے تھے اور شاگرد میاں دلگیر مرثیہ گو کے تھے۔ یہ شہرت میاں مذکور نے [کذا]، میاں ضمیر صاحب کی سن کے شاگرد ہوئے۔ عرصہ تک ان کو مرثیہ دکھلایا۔ جب کلام ان کا اچھا ہونے لگا تو میر باقر سوداگر کے امام باڑہ میں یہ مرثیہ پڑھنے پر مقرر ہوئے ہر ماہ کی پچیس تاریخ کو۔ جب ماہ محرم ہوا، تب میر باقر مرحوم نے نواب بادشاہ محل صاحبہ سے سرکار میں اور نواب قدسیہ محل صاحبہ سے عرض کیا اور سبحان علی خان صاحب کمبو؟؟ کی سرکار میں اور راجہ میوہ رام خطاب افتخار الدولہ بہادر سے ان کے مرثیہ کی تعریف فرمائی۔ یہ سن کے راجہ میوہ رام صاحب مرحوم نے طلب فرمایا اور وہ مجلس میاں ضمیر صاحب کے پڑھنے کی تھی اور ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔ جب سوز خوان مرثیہ پڑھ چکے تو مرزا دبیر صاحب کو جناب راجہ صاحب نے حکم دیا مرثیہ پڑھنے کا، اس وقت میر ضمیر صاحب اپنے دل میں نہایت مرزا مذکور سے خفا ہوئے۔ یہ جب منبر پر گئے تو ان کے کان میں استاد نے ان کے یہ کلمہ آہستہ سے کہا کہ تم آج سلام پڑھنا، یہ مجلس میرے پڑھنے کی ہے۔ مرزا دبیر نے عرض کیا کہ اگر اہل مجلس مجھ سے مرثیہ پڑھوائیں گے تو میں مرثیہ پڑھوں گا، اگر نہ پڑھائیں گے تو سلام پر ختم کروں گا۔ یہ کہہ کر مرثیہ شروع کر دیا۔

جب دولتِ اولاد شہِ دیں نے لٹا دی

نہایت ان کے مرثیہ نے لطف اہل مجلس کو دکھلایا۔ دو گھڑی تک مرثیہ پڑھا۔ جب فراغت پائی تو منبر پر سے اتر

آئے تو تب نہایت میر ضمیر کو رنج حاصل ہوا۔اس وقت راجہ میوہ رام صاحب نے میر صاحب سے ارشاد فرمایا۔ میر ضمیر صاحب نے انکار کیا کہ میرے مرثیہ پڑھنے کی کچھ ضرور نہیں، مرزا صاحب نہایت عمدہ مرثیہ پڑھ چکے ہیں۔ یہ سن کے مداح نے فرمایا۔حقیقت میں آپ سچ ارشاد فرماتے ہیں مگر چند کلمہ برائے ثواب آپ بھی ارشاد فرمائیں۔ آخرش ناچار ہو کر یہ منبر پر گئے اور زبان مبارک سے چند کلمہ حدیث کے پڑھے۔ روتے روتے تمام مجلس بے ہوش ہو گئی اور منبر پر سے اتر آئے۔ اس وقت ان کو بیس پارچہ کا خلعت اور تین ہزار روپیہ نقد عنایت ہوا۔صبح کو مرزا دبیر صاحب [نے] پانچ اشرفی نذر ضمیر صاحب کو جا کر دیں۔ میر صاحب نے نہ منظور کیں اور کہا کہ تم کو شاگردی کی کیا حاجت ہے۔ اب یہاں تشریف نہ لائیے گا۔اس دن سے ایک ان کو رنج رہا۔محمد علی بادشاہ کے زمانہ میں یہ سو روپیہ کے ماہواری کے ملازم ہوئے، بیٹا کوئی نہ تھا،ایک بیٹی تھی، اس کی شادی نہایت دھوم سے کی جس طرح لوگ بیٹی کی شادی کرتے ہیں۔ عارضہ بخار میں چند عرصہ کے بعد انتقال کیا۔دفن کربلا میں ہیں۔

ان اقتباسات سے اس تذکرے کی اہمیت اور دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔

تذکرے کی ترتیب و تدوین کا کام جاری ہے اور جلد مکمل ہو کر شائع ہو گا۔متن میں کہیں تذکرے کا عنوان درج نہیں ہے لہٰذا راقم الحروف نے اس کے مشمولات کی بنا پر اس کا نام تذکرۂ شعرابے لکھنؤ تجویز کیا ہے۔امید ہے کہ یہ تذکرہ انیسویں صدی کے ہندوستان بالخصوص لکھنؤ کی فضا اور اس کے ادبی و علمی ماحول کے نئے گوشے روشن کرنے میں مفید ثابت ہو گا اور اہل علم کے لیے اس میں تحقیق و جستجو کے کئی پہلو وا ہوں گے۔

حواشی و حوالہ جات

* شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

۱۔ فرمان فتح پوری، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۸ء)، ۶۲۷-۶۳۲۔

۲۔ سرب سنگھ کا تخلص دیوانہ تھا۔ راجا مہانرائن کے بھانجے تھے۔ چار فارسی دیوان ان کی یادگار ہیں۔
نساخ، سخن شعرا (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۶)، ۱۶۳۔

۳۔ میر نواب مونس، خلف اور شاگرد میر مستحسن خلیق، مولد و مسکن لکھنؤ، صاحب دیوان تھے۔
انصار اللہ (مرتب)، جامع التذکرہ، جلد سوم (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)، ۹۰۴۔

۴۔ وزیر کے بارے میں زیر نظر تذکرے میں ایک طویل بیان موجود ہے جب کہ سخن شعرا میں صرف اسی قدر لکھا گیا ہے:
وزیر تخلص، خواجہ محمد وزیر لکھنؤ، خلف خواجہ محمد فقیر، شاگرد امام بخش ناسخ۔ سلسلہ ان کے نسب کا خواجہ بہاء الدین نقشبند علیہ رحمۃ سے ملتا ہے۔ اپنے طرز پر شعر اچھا کہتے تھے۔ بائیسویں ماہ ذی قعدہ ۱۲۷۰ بارہ سو ستر ہجری میں فوت کی۔ دیوان ان کا نظر سے گذرا۔

اس کے بعد ڈھائی صفحات پر نمونۂ کلام درج ہے۔نساخ، سخن شعرا، ۵۴۹–۵۵۲۔

۵۔ نساخ، سخن شعرا، ۱۵۰۔

۶۔ نساخ، دفتر بے مثال (کلکتہ: مظہر العجائب پریس، ۱۸۶۳)۔

۷۔ محمد صدر الحق، نساخ۔ حیات و تصانیف (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۷–۷۹)۔

۸۔ سید لطیف الرحمان، نساخ سے وحشت تک (کلکتہ: عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۵۹)۔

۹۔ محمد حامد علی خان، ہندوستانی ادب کے معمار۔ عبد الغفور خان نساخ (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۳)۔

۱۰۔ ایف بی بریڈلے برٹ (F. B. Bradley-Birt)، *Twelve Men of Bengal in the Nineteenth Century* (کلکتہ: ایس کے لہری اینڈ کمپنی، ۱۹۱۰)، ۱۱۱–۱۴۰۔

۱۱۔ ای بی کاول (Edward Byles Cowell: 1826–1930) بے حد صاحب علم شخصیت اور ماہر السنۂ مشرق ولیم جونز سے متاثر تھے۔ ۱۸۵۶ میں پریذیڈنسی کالج کلکتہ میں تاریخ اور معاشیات کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۸ میں سنسکرت کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ اور ۱۸۶۷ میں کیمبرج یونی ورسٹی میں سنسکرت کے پہلے پروفیسر کے طور پر تعینات ہوئے۔ نہایت قابل قدر علمی خدمات اور متعدد تصانیف کے اعتراف کے طور پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۹۸ میں انھیں طلائی تمغے سے نوازا۔

سی ای بک لینڈ (C. E. Buckland)، *Dictionary of Indian Biography* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵)، ۹۸۔

۱۲۔ رمل ایک علم ہے جس کی مدد سے لکیروں اور ہندسوں کے ذریعے غیب کی باتیں بتاتے ہیں۔

۱۳۔ جفر تعویذ لکھنے یا غیب کی باتیں بتانے کا علم ہے۔

۱۴۔ ہاتھ کے انگوٹھے اور بیچ کی انگلی کے ناخن سے کاغذ پر ابھری ہوئی تحریر بنانا۔

۱۵۔ نساخ، خود نوشت سوانح حیات (کلکتہ: ایشیاٹک سوسائٹی، س ن)، ۴۰–۴۶۔

۱۶۔ نساخ نے وحشت کا تذکرہ سخن شعرا میں بھی کیا ہے اور ان کے وصال (۱۲۷۴ ہجری) پر کہی جانے والے تین قطعات تاریخ درج کیے ہیں۔ وہ ابتدا میں حافظ اکرام احمد ضیغم سے اصلاح لیتے تھے۔

نساخ، سخن شعرا، ۵۴۲–۴۳۔

۱۷۔ صیغم کے بارے میں نساخ سخن شعرا میں لکھتے ہیں:

> عروض و قوافی اور صنائع و بدائع میں فی زمانہ بے مثل ہیں۔ جمیع اصناف سخن پر قادر ہیں۔ شعر پر مضمون اور عاشقانہ فرماتے ہیں۔ ہزل اور ریختی اور مرثیہ میں مہمان تخلص کرتے ہیں۔ بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے۔ بہت سی زبانوں سے واقف ہیں۔ طب یونانی اور ہندی و ڈاکٹری اور بیشتر فنون و ہنر میں کامل ہیں۔ چودہ پندرہ برس تک کلکتہ میں تھے۔ سات آٹھ برس سے ڈھاکا میں تشریف فرما تھے۔ کیمیا گر مشہور ہیں۔ بارہ سو چھیاسی میں انتقال کیا۔

نساخ، سخن شعرا، ۲۹۲۔

۱۸۔ نساخ، خود نوشت سوانح حیات، ۹۔

۱۹۔ محمد صدر الحق، ۹۷–۱۵۴۔

۲۰۔ نساخ، دفتر بے مثال (لکھنؤ: مطبع منشی نول کشور، س ن)، ۱۔

۲۱۔ نساخ عبد اللطیف خان کے سگے بھائی تھے۔

۲۲۔ گارساں دتاسی، خطبات گارساں دتاسی (اورنگ آباد، دکن: انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۵)، ۴۲۶–۷۔

۲۳۔ محمد صدر الحق، ۱۵۷–۱۸۸۔

۲۴۔ https://www.rekhta.org/search/ebooks?lang=3&q=abdul%20ghafoor%20nassakh

۲۵۔ نساخ، قطعہ منتخب، مرتبہ انصار اللہ نظر (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۷۴)، ۲۔

۲۶۔ اس تذکرے کے بارے میں تمام معلومات محمد صدر الحق کی تصنیف، نساخ۔ حیات و تصانیف سے حاصل کی گئی ہیں۔ص ۲۵۱–۲۵۸۔

۲۷۔ محمد صدر الحق، ۲۶۸۔

مآخذ

انصار اللہ (مرتب)۔ جامع التذکرہ۔ جلد سوم ۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔

بریڈ لے برٹ، ایف بی (F. B. Bradley-Birt)۔ *Twelve Men of Bengal in the Nineteenth Century* ۔ کلکتہ: ایس کے لہری اینڈ کمپنی، ۱۹۱۰۔

بک لینڈ، سی ای (C. E. Buckland)۔ *Dictionary of Indian Biography* ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵۔

پوری، فرمان فتح ۔اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۸ء۔

خان، محمد حامد علی ۔ ہندوستانی ادب کے معمار۔ عبد الغفور خان نساخ ۔نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۳۔

دتاسی، گارساں ۔ خطبات گارساں دتاسی ۔اورنگ آباد، دکن: انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۵۔

صدر الحق، محمد ۔ نساخ۔ حیات و تصانیف ۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۷–۷۹۔

لطیف الرحمان، سید ۔ نساخ سے وحشت تک ۔کلکتہ: عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۵۹۔

نساخ۔ سخن شعرا ۔لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۶۔

______۔ دفتر بے مثال ۔کلکتہ: مظہر العجائب پریس، ۱۸۶۳۔

______۔دفتر بے مثال ۔لکھنؤ: مطبع منشی نول کشور، س ن۔

______۔خود نوشت سوانح حیات ۔کلکتہ: ایشیاٹک سوسائٹی، س ن۔

______۔ قطعہ منتخب۔ مرتبہ انصار اللہ نظر ۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۴۔

برقی ماخذ

https://www.rekhta.org/search/ebooks?lang=3&q=abdul%20ghafoor%20nassakh